دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر، اعظم گڑھ

رسالہ
نبوّت

افادات

علامہ حمید الدّین فراہیؒ

دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ
الہند

جملہ حقوق محفوظ

© دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

نام کتاب: رسالۂ نبوت

سن اشاعت: ۱۹۹۴ء

تعداد: ایک ہزار ایک سو

کتابت: جلال الدین احمد

مطبع:

قیمت: پندرہ روپے

تقسیم کنندگان

۱- دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یو-پی

۲- ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، سرسید نگر، علی گڑھ

۳- البلاغ بک سنٹر، ۲/۶۵، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انبیاء کی ضرورت

نبی کی ضرورت اس لیے نہیں کہ انسان کی عقل رب کی معرفت اور عدل کے شعور سے بالکل خالی ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ پیغمبر اسے اس چیز کی یاد دہانی کرائے جسے وہ جانتا ہے، نیز اس لیے کہ انسان کے پاس دو چیزیں بطور شاہد کے ہوں: اندر سے عقل کی شہادت اور باہر سے وحی کی، تاکہ ہدایت کے اسباب زیادہ ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو، جیسا کہ سورہ انعام میں فرمایا ہے:

يَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ	اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا
يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ	تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول نہیں
يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي	آئے جو تمہیں میری آیتیں سناتے اور
وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ	تمہارے آج کے دن کی ملاقات سے
هٰذَا قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ	تم کو ہوشیار کرتے رہے۔ وہ بولیں گے
أَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ	ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں، اور ان کو
الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ	دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا، اور
أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا	وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ
كَافِرِينَ ۝ ذٰلِكَ أَنْ لَمْ	بے شک وہ کافر رہے۔ یہ اس وجہ سے
يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ	کہ تیرا رب بستیوں کو اس حال میں ان کے

الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔	ظلم (یعنی برائیوں) کی پاداش میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں۔
(۱۳۰-۱۳۱)	

نیز فرمایا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔	بھیجے رسول خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔
(سورۂ نساء ۱۶۵)	

پس پیغمبروں کو بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم پر ایک مزید احسان ہے کہ اس نے ہماری فطرت کے اندر حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت رکھنے کے بعد یہ فضل فرمایا چنانچہ عقل مند انسان جب نفسانیت کی گہری تاریکیوں، عقل کی گمراہیوں اور اہل عقل کی ان رایوں کے اندر تضادات کو دیکھتا ہے جنھیں وہ انسان کی بہبود کے لیے پیش کرتے ہیں تو وہ اللہ کے اس فضل پر اس کا شکر گزار ہوتا ہے اور اسے ذریعۂ نجات سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس سے تعلق جوڑتا ہے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اس طرح اسے نجات کی راہ مل جاتی ہے اور وہ سکون و اطمینان کی زندگی گزارنے لگتا ہے جس طرح اس دنیوی زندگی میں حکومت کے وجود اور عدل و انصاف کے قیام کو وہ غنیمت سمجھتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تہذیب و تمدن میں آگے بڑھ سکے۔ اس لیے نبوت کی ضرورت سے انکار کرنے والا اس شخص کے مانند بلکہ اس سے بھی بُرا ہے جو حکومت کی ضرورت کا منکر ہو اور تہذیب و معاشرت کی اس اصل کو جو مقتضائے فطرت انسانی ہے ڈھا دینے کی دعوت دیتا ہو۔

نیک دل انسانوں کو جس طرح حکمرانوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انھیں انبیاء کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی حکومت اور نبوت کو ہم ایک ساتھ نہ دیکھتے۔ اس سے اس بات کا یقین پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت ان دونوں کی طلبگار ہے؛

اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عدل کو پسند کرتا ہے، دار آخرت اور جزائے اعمال کو یقینی جانتا ہے اور خدا کے عادل ہونے پر اسے یقین کامل ہوتا ہے۔ گمراہی کے پیشواؤں اور سرکش سرداروں کا وجود اس کو غیر فطری ثابت نہیں کر سکتا جس طرح زمین میں فساد مچانے والے دشمنانِ حق اور رعایا پر ظلم کرنے والے جابر حکمرانوں کا وجود اس بات پر دلیل نہیں ہو سکتا کہ عدل انسان کی فطرت میں نہیں ہے۔ اس طرح کے امور کو ہم امراض کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں۔ انسان کی فطرت سے ہماری مراد وہ چیز ہے جس کی طلب انسان کو حالت صحت میں ہو۔

نبوّت کی ضرورت کے سلسلہ میں دو باطل رائیں اور غلطی کا سبب

کچھ لوگوں نے فطرت کا درجہ اتنا بڑھا دیا کہ انبیاء کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا، اور ایک طبقہ نے اس کی اصل حیثیت سے اسے نیچے گرا دیا اور کہنے لگے کہ نفس کی آلودگیوں اور اس کی فطری کمزوریوں سے بچنے اور نجات پانے کے لیے واقفیت کا کوئی راستہ نہیں، اس لیے ایک نجات دہندہ ضروری ہے۔

یہ دونوں باتیں انسانی فطرت کے دو پہلوؤں پر الگ الگ زاویہ سے نظر ڈالنے کا نتیجہ ہیں۔۔۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ خلق کے معاملات امکان محض اور اتفاقات کی بنیاد پر نہیں چلتے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بندوں کی قوتوں اور صلاحیتوں میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔ مثلاً اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی قسم کا رزق دیتا یا اس کے کسب کے لیے کوئی ایک ذریعہ بناتا بلکہ اگر وہ انھیں ایک ہی آنکھ اور کان دیتا تو ان کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں دے کر انسانوں پر احسان کیا ہے اور بہت سے معاملات میں اپنی دیگر مخلوقات پر انھیں فضیلت دی ہے۔ اسی طرح ہدایت کے لیے بھی اس نے بہت سے اسباب فراہم کیے ہیں جن سے ان کے اوپر اپنی نعمت اور حجت دونوں پوری کر دی۔

اگر وہ ہدایت کے معاملہ میں محض فطرت کی بنیاد پر ان سے مواخذہ کرتا تو یہ بھی عدل ہوتا کیونکہ زمین و آسمان اس کی نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اور صحیفوں کو نازل کر کے ہم انسانوں پر احسان کیا ہے۔ شریعت کو جو نعمت کہا گیا ہے تو اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے

انسان فطری طور پر حکم کا پابند ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔
(سورہ بقرہ - ۱۸۶)

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرے حکم کو مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ صحیح راہ پر رہیں۔

معلوم ہوا کہ تمام جانداروں کی طرح انسان بھی پیدائشی طور پر احکام فطرت کا پابند ہے، لیکن وہ ظلوم وجہول ہے (یعنی اپنی فطرت کے خلاف چلنے کی اسے آزادی ہے۔ اگر اپنی نادانی سے وہ خلاف فطرت کام کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس امر فطری کو "معروف" اور "امر" کہا ہے جیسا کہ فرمایا:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ۔
(سورہ اعراف ۵۴)

آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے۔

نیز فرمایا:

فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ۔
(سورہ بقرہ – ۲۲۲)

ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو بتایا ہے۔

اسی امر فطری کی بنیاد پر وہ انبیاء کی اطاعت کے سلسلہ میں لوگوں کا مواخذہ کرتا ہے، اور اسی وجہ سے اس نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت بتایا ہے، اور اپنے دین کو دین فطرت اور صراط مستقیم

کہا ہے۔ چونکہ پیغمبر اسی کی یاددہانی کے لیے ہوتا ہے اس لیے اسے "مذکِّر" کا نام دیا۔ یہ امر فطری ہر قانون کی اساس ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی چیز نیکی کہلاتی اور نہ بدی اور مخلوقات کی پیدائش عبث قرار پاتی۔ پیغمبر درحقیقت اسی امر فطری کی آواز ہے۔

نبی کی تعریف اور آغاز نبوت

میں

اس کے احوال و معاملات

۱۔ جن لوگوں نے قرآن مجید اور آسمانی صحیفوں میں پیغمبروں کے احوال کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ بات واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی ذات میں کمال بشریت کا نمونہ تھے جن پر مبدأ فیاض خدائے مطلق کی جانب سے ان کے حسب استعداد وحی جلی کا فیضان ہوا۔ انسان کی فطرت پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے اور کتاب الٰہی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک پاکیزہ روح ڈال کر اس کا اکرام کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک مہربان اور عادل وحاکم خدا کے وجود کا الہام اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی کی ترجمان ہیں سورہ فاتحہ کی یہ آیتیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝
(سورہ فاتحہ ۱-۳)

تمام شکر اللہ رب العالمین رحمٰن الرحیم، مالک روز جزا کے لیے۔

لیکن کثیف دلوں میں اس الہام پر خواہشات کے پردے چھائے رہتے ہیں البتہ جن کی فطرت کامل ہوتی ہے اور جو پاکیزہ خصلت ہوتے ہیں وہ بلا شائبۂ شک اس پر روز روشن کی طرح یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہر نبی کو جزا اور عدل و قسط پر کامل یقین ہوتا ہے اور ظلم اور کفران نعمت سے وہ دور بھاگتا ہے۔ اپنے دل میں رحم اور شفقت کے جذبہ کو موجزن پاتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنے والے اور مہربان خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی بندگی میں لگا رہتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کے عدل پر ایمان کی وجہ سے اور اس سبب سے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں پر اپنے شرف اور خود کے لیے ان کی سجدہ ریزی کو پہلے سے دیکھ لیا تھا کس طرح وحی کی گئی کہ ان کے بھائیوں کا ظلم جلد ہی ان پر عیاں ہو جائے گا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔
(سورہ یوسف ۱۵)

پس جب وہ اس کو لے گئے اور طے کر لیا کہ اسے کنویں کی تہ میں پھینک دیں گے اور ہم نے اس کو وحی کی کہ تم انھیں ان کی کارستانی سے آگاہ کرو گے جب کہ ان کو کچھ خیال بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح مظلوم کی مدد کے لیے بے چین ہو گئے اور قبطی کو گھونسا مارا درآں حالے کہ اس وقت آپ کی عمر زیادہ نہ تھی۔ ایسے ہی پیغمبروں کے حالات میں آپ کو نظر آئے گا کہ جب وہ رب رحیم کی معرفت پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسی کی نعمتوں کے پروردہ ہیں، پھر اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اس کے عدل کو دیکھ کر اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ جزا برحق ہے تو سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاتے ہیں اور اپنے تمام معاملات میں اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اپنے اس حال کی ترجمانی بزبان الٰہی یوں کرتے ہیں:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس وقت سب سے پہلی اور اعلیٰ چیز جس کی پیغمبر کو طلب ہوتی ہے وہ اس کے رب کی پسندیدہ راہ یعنی عدل کا راستہ ہے جس پر وہ سارے عالم کو چلا رہا ہے۔ اس پر گامزن رہنے کے لیے وہ اس سے استعانت چاہتا ہے کہ یہی راستہ تمام مخلوق کے لیے متعین ہوا ہے جو کہ اطاعت اور بندگی کا راستہ ہے۔ اس راہ پر چلنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزاروں کے سلسلہ میں شامل ہونا ہے اور گمراہی کی اس گھاٹی سے نکلنا ہے جو خدا سے دور لے جانے والی ہے پیغمبر

اسی کا آرزومند ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے اس کی فطری طلب ہی کے موافق یہ وحی کی جاتی ہے:

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔	ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما (یعنی عدل وحق کے راستہ کی جو خدا تک لے جانے والا ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ، بے شک میرا رب ایک سیدھے راستہ پر ہے۔ سورہ ہود ۵۶)
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔	ان لوگوں کے راستہ کی جن پر تو نے فضل فرمایا (یعنی عدل وقسط پر قائم رہنے والے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ دکھائی)
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ	جو مغضوب نہیں ہوئے (کیوں کہ مغضوبین نے باوجود علم کے حق کو ٹھکرا دیا اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی)
وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔	اور نہ گمراہ (کیوں کہ گمراہوں کے قلب پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی، چنانچہ وہ بھی علم سے محروم ہو گئے اور بہائم کی طرح اندھے بہرے بن گئے)

یہی ہے فطرت انسانی کے کمال کے اعتبار سے قلب انسانی میں ڈالی ہوئی وہ کامل بات جسے صرف پاک باطن سنتے ہیں اپنی فطرت کے اس نہاں خانے سے جو روح قدسی کے نزول کی جگہ ہے۔

۲۔ پھر جب نبی کا سینہ فطری الہام سے بھر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ وحی کی مزید نعمت سے اسے نوازتا ہے تاکہ وہ ظالموں کو ڈرائے (اور وہ اس کو امام بناتا ہے۔ اس کی پہلی تعلیم توحید اور جزا وسزا کی ہوتی ہے اور اس کی اصل شکر ہے جس کی ضد کفر ہے) اور انھیں خواب غفلت سے جگائے۔ سورہ مومن میں فرمایا ہے:

يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ۔ (۱۵)	وہ القا کرتا ہے روح کو جو اس کے امر میں سے ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے آگاہ کر دے۔

۳۔ نبی کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اسی لیے آپ قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ یہ رسالت کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ سورہ طلاق میں ہے:

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱۰ - ۱۱)	اللہ نے تمھاری طرف ایک یاددہانی اتاری ہے، ایک رسول جو تمھیں اللہ کی واضح آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔

یہ اسی طرح کا بدل ہے جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ، مِنْ فِرْعَوْنَ، اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (سورہ دخان ۳۰ - ۳۱)	اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی (یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ بڑا ہی سرکش تھا حدود سے نکل جانے والا۔

اس آیت میں فرعون کو عذاب کے بدل کے طور پر پیش کیا گیا ہے گویا کہ وہ خود عذاب ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ آپؐ کا اخلاق قرآن ہے۔ یعنی قرآن آپؐ کے باطن کا آئینہ ہے۔ ہم جو کچھ قرآن میں دیکھتے ہیں وہ آپ کے اخلاق سے کلّی مطابقت رکھتا ہے، جس طرح ہر صناع کا عمل اس کی اپنی تصویر ہوتا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید وحی الٰہی ہے لیکن فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ اللہ کا کلام اسی پر نازل ہوتا ہے جو اس کی استعداد رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ وحی کو پیغمبر کے حال سے

سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والی چیز پائیں گے۔

پیغمبر دوسرے تمام انسانوں کی طرح تعلیم و تربیت پاتا ہے لیکن اس کی پوشیدہ فطرت وقت وقت پر ظاہر ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ ترقی کے منازل طے کرنے میں وہ سب سے بہتر راہ اختیار کرتا ہے جب کہ دوسرے لوگ یا تو اس سے عاجز رہنے کی وجہ سے نیچے گر جاتے ہیں یا جہل کی وجہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ اوائل عمر اور آغاز امر میں وہ اپنے ظاہری احوال کے اعتبار سے اور انسانوں ہی کی طرح معلوم ہوتا ہے، پھر وہ منزل بہ منزل ان پر سبقت حاصل کرتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کی سعی و جہد اور استعداد کے مطابق اپنی بخششوں سے نوازتا ہے۔ چنانچہ جب پیغمبر اس درجۂ خاص پر جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، پہنچ جاتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے سابق علم کے مطابق اس کا انتخاب پہلے سے کر چکا ہوتا ہے اور یہ معاملہ کا دوسرا پہلو ہے۔

پھر جب پیغمبر پر وحی آنے لگتی ہے اور وہ منصب نبوت پر سرفراز ہو جاتا ہے تو اس کے سلوک کی راہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ برابر تقرب کے راستہ پر چلتا رہتا ہے اور علم، بصیرت، یقین اور تقویٰ و توکل کے درجات کو اس منزل تک طے کرتا ہے جہاں تک خدا چاہتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی بخششوں اور نوازشوں کی کوئی انتہا نہیں۔

اصل اور بنیادی بات یہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔ قرآن اور سابق آسمانی صحیفے اس پر دلیل ہیں۔ اس سے چند باتیں سامنے آتی ہیں؛ ایک تو یہ کہ پیغمبر اپنی فطرت، اپنی استعداد اور اس علم کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کو اس کے متعلق پہلے سے ہے تمام انسانوں پر فوقیت رکھتا ہے گرچہ بشکل ظاہر وہ اپنے ابتدائی احوال میں دیگر انسانوں کی مانند ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قبل از ضرورت اور قبل از وقت یعنی منزل خاص تک پہنچنے سے پہلے اسے حق کا تفصیلی علم نہیں ہوتا لیکن جب کوئی امر واقع ہوتا ہے تو حق اس پر واضح ہو جاتا ہے اور حق و باطل میں فرق کو وہ جان لیتا ہے۔

پھر وحی و کلام الٰہی سے مشرف ہونے کے بعد وہ بعض امور میں بسا اوقات خود کوئی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ وحی کا انتظار کرتا ہے۔ اور اس کا یہ سکوت اور انتظار اس کی صحت رائے اور اس کے فہم معاملہ کی علامت ہوتا ہے۔

نبی کی فطرت اور اس کے کلام میں مصالح کی رعایت

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اپنی مخلوق کا ہادی و رہبر بنایا ہے اسی لیے انھیں بشریت کا لباس عطا کیا ہے اور ان کے اندر رحمت و غضب، حسرت و الم، دل گرفتگی و ندامت، رنج و احساس گناہ اور توبہ و تضرع کے جذبات رکھے ہیں تاکہ وہ اپنی امت کے موافق حال ہوں اور ان کی پیروی کرنے والے ان سے اثر قبول کریں۔ اگر انبیا فرشتوں کی طرح جذبات سے عاری ہوتے تو ان کی بات ان کی قوم پر اثر انداز نہ ہوتی کیوں کہ جذبات سے خالی کلام اخبار محض ہوتا ہے جس میں نہ کوئی زور ہوتا ہے اور نہ کشش۔ اسی طرح کی رعایت وحی کی زبان میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام الٰہی میں ہم کو خدا خوش، راضی، غضب ناک اور عتاب و انتقام سے کام لینے والا دکھائی دیتا ہے۔ کلام الٰہی میں یہ رعایت اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ اس کے کلام سے فائدہ اٹھا سکیں ورنہ وہ لوگوں کی فہم سے بعید ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۔ (سورہ انعام ۹)	اگر ہم اس کو فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے اور جو شبہ وہ پیدا کر رہے ہیں اسی میں ان کو پھر ڈال دیتے۔

البتہ بعض انبیا جو ملائکہ سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے جیسے یحییٰ علیہ السلام تو ان سے لوگوں نے کم ہی فائدہ اٹھایا۔ ان کی آمد تمام تر حجت کے لیے تھی جیسے کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد۔

کلام وحی میں مخاطب کی رعایت کی وجہ سے کبھی کبھی کلام کو اس کی متعین شاہراہ سے ہٹانا پڑتا ہے۔ ہر بلیغ بات کہنے والا جو صاحب حکمت ہوتا ہے اپنے کلام میں ایسا ہی کرتا ہے اور یہ ایک مہتم بالشان باب ہے۔

لیکن وحی کے سلسلہ میں جو بات یہاں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا سب سے بڑا مقصد

اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنا ہے۔ اس کے کسی ایک پہلو پر نظر ڈالنے ہی سے قلب بھر جاتا ہے۔ ایک وصف قلب پر مستولی ہوتا ہے تو دوسرے کے لیے گنجائش نہیں رہ جاتی، لازماً دوسرے ذہول ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ پردہ اسی قدر ہٹایا جائے جتنی کہ قلب میں سمائی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لوگوں کے قلوب ٹیڑھے اور عقلیں دہشت زدہ ہو کر رہ جائیں۔

کسی قوم کے اندر نبی کی بعثت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی اصلاح کرے اور انھیں صراط مستقیم کی طرف بلائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ عادات و شمائل میں اپنی قوم کے مشابہ ہو ورنہ بعثت کی حکمت کے خلاف بات ہوگی، جیسا کہ فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۔ (سورہ انعام ۹)	اگر ہم اس کو فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے اور جو شبہ وہ پیدا کر رہے ہیں اسی میں ان کو پھر ڈال دیتے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبوت کے منصب کا سب سے زیادہ سزاوار وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم سے جس میں وہ مبعوث ہوتا ہے اخلاق میں قریب تر ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی قوم کے لوگ اس سے بہت زیادہ بُعد محسوس کریں، اور اگر اس حکمت کی رعایت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو حکم نہ دیتا کہ وہ اپنی قوم کو نرم اور موثر کلام سے خطاب کریں۔

بایں ہمہ اس بات میں شبہ نہیں کہ پیغمبر امت کے بُرے اخلاق سے بہت دور ہوتا ہے، اس حد تک کہ علماء نے ان کی بُرائیوں کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تاکہ نبی کی ضرورت و اہمیت اور قوم پر پڑنے والے اس کے اثرات کی عظمت کو اس طرح نمایاں کر سکیں کہ گویا وہ کوئی اکسیر ہو جو مسِ خام کو کندن بنا دے، یا ایسا ابر ہو جو بالکل مُردہ زمین کو زندہ کر دے۔ بلاشبہ اپنی اس بات میں وہ حق بجانب ہوتے اگر اس کے ایک اہم جز یعنی محاسن اخلاق میں پیغمبر کی اپنی امت سے مشابہت کے پہلو کو انھوں نے نظر انداز نہ کر دیا ہوتا۔

نبی اور اس کی امت کے درمیان مماثلت کے پہلو

۱۔ ہر نبی اپنی قوم کا عطر اور اس کا خلاصہ ہوتا ہے جس طرح درخت کی شاخ سے پھول یا پتھر کے اندر سے جوہر نکلتا ہے۔ وہ قوم کے متفرق محاسن کا جامع اور ان کی تمام برائیوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔ ہر قوم کے اندر مختلف قسم کی اچھائیاں اور برائیاں پائی جاتی ہیں جس طرح مخلوقات کی مختلف انواع میں ہوتی ہیں کیوں کہ یہی طریقۂ فطرت ہے اور یہی تقاضائے حکمت۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ پیغمبر کی طرف سبقت کرنے والوں میں اول اس کی قوم کے شریف النفس اور پاکباز لوگ ہوتے ہیں۔ مومنین میں سے سابقین کو جو فضیلت کا درجہ ملا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جب افق سے روشنی نمودار ہوتی ہے تو سب سے پہلے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی منور ہوتی ہے، پھر جو اونچائی میں اس سے قریب تر ہو۔ اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے کی چوٹیاں روشن ہوتی جاتی ہیں۔ یا آسمان سے بارش ہو تو جو زمین زیادہ زرخیز ہوتی ہے وہ پہلے لہلہا اٹھتی ہے۔ یہی حال امت کا ہے، اس میں سب سے پہلے پیغمبر کی ذات بیدار ہوتی ہے پھر صدیقین، شہداء اور صالحین متنبہ ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کے متبعین کا نمبر آتا ہے۔ اور جب یہ فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ دانوں کو جمع کر کے الگ کر لیتا ہے اور خس و خاشاک کو آگ میں جھونک دیتا ہے۔

۲۔ یہیں سے آپ پر وہ حکمت واضح ہوگی جو پیغمبر اور ان کے اصحاب کو سخت آزمائشوں سے گزارنے میں ملحوظ رکھی گئی ہے تاکہ جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہو وہ کافروں اور منافقوں کی صف میں نہ رہ جائے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ مومنین کو چھانٹ لیتا ہے تو کافروں کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اس چھان پھٹک میں وہ مومنین کی صف میں سے ان لوگوں کو بھی خارج کر دیتا ہے جو بغیر نور ایمان کے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کی تصریح ایک سے زائد مقامات پر ہے تفصیل معجزات کے باب میں ملے گی۔

۳۔ چونکہ پیغمبر اپنی قوم کا خلاصہ یا جوہر خالص ہوتا ہے اس لیے وہ اور اس کی قوم آپ کو مثل دو آئینہ کے نظر آئیں گے جن میں سے ایک کو دوسرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر پیغمبر غایت درجہ بلند ہمت اور وسیع التدبیر ہو تو یقین کر سکتے ہیں کہ اس کی قوم حریت پسند اور سریع الذہن ہوگی۔ اسی طرح اگر اس کی قوم بہتر اخلاق کی حامل نظر آئے تو یقینی امر ہے کہ ان کا پیغمبر ان کے تمام اخلاق کا جامع ہوگا۔ اسی سے کسی امت اور اس کے پیغمبر کو سمجھنے کی کلید ہاتھ آتی ہے اور ایک سے دوسرے پر آپ استدلال کر سکتے ہیں نیز اس سے کسی امت اور شریعت کو سمجھنے کے لیے آپ کو دلیل بھی مل سکتی ہے کیوں شریعت امت کی استعداد کے لحاظ سے دی جاتی ہے، جیسا کہ سورہ مائدہ میں تورات، انجیل اور قرآن کے نازل کرنے کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔ (۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ضابطۂ شریعت اور طریقہ ٹھہرایا ہے حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے چاہا کہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اس نے تم کو بخشی ہے تو بھلے کاموں میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

یہی اللہ تعالیٰ کی عام سنت رہی ہے جیسا کہ سورہ انعام کے آخر میں فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ۔ (۱۶۵)

اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کے درجے بعض پر بلند کیے تاکہ تمہیں جو کچھ اس نے بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے۔

گویا اللہ تعالیٰ کسی امت کو جو چیز دیتا ہے اسی میں اس کو آزماتا ہے۔ اسی لیے ہر امت کو اس کے موافق حال شریعت دی گئی، ان میں جو فرق ہے وہ اسی پہلو سے ہے اور کامل ترین شریعت اس امت کو دی گئی جو سب سے زیادہ کامل تھی۔

امت پر پیغمبر کی اطاعت واجب ہے

۴۔ پچھلی باتوں سے آپ نے یہ جان لیا ہوگا کہ پیغمبر اپنی قوم کا حاس قلب ہوتا ہے۔ قوم کے اندر اس کی حیثیت کان، آنکھ اور دل کی ہوتی ہے تو جس طرح لوگوں کے لیے اپنے قلب کی روشنی میں چلنا ضروری ہے اسی طرح ان کی جماعت پر اپنے پیغمبر کی اطاعت واجب ہے اور جس طرح ایک فاجر اپنے قلب کی روشنی کے خلاف چلتا ہے اور برائی کو برائی جانتے ہوئے خواہشات کی پیروی میں لگا رہتا ہے اسی طرح فاجروں کی جماعت پیغمبر کی نافرمانی میں سرگرم رہتی ہے حالانکہ وہ لوگ اس کی صحت رائے اور جذبۂ خیر خواہی و ہمدردی کو خوب جانتے ہیں۔ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ کافروں نے محض ظلم اور سرکشی کی وجہ سے اس چیز کو جھٹلا دیا جس سے وہ بخوبی واقف تھے۔

کلام وحی کی باطن فطرت سے موافقت

اللہ تعالیٰ کا کلام پیغمبر کو اس وقت سنائی دیتا ہے جب اس کے قلب کی اصلاح ہو چکی ہوتی ہے جس طرح زمین کے ہموار ہو جانے کے بعد ہی اس میں بیج ڈالا جاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے پیغمبر کے شرح صدر اور اس کے قلب کو غسل دینے کی۔ اسی لیے انبیاء کے قصوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب کی طرف سے بصیرت اور روشنی حاصل ہو جانے کے بعد ہی وحی کی گئی۔ چنانچہ پیغمبر حق و باطل کے فرق کو پہلے جان لیتا ہے پھر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے تو وہ اس چیز پر شاہد ہوتی ہے جو اس پر پہلے ظاہر ہو چکی ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ ہود میں انبیاء کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ	کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے برہان
مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ	پر ہے پھر بعد میں ایک گواہ بھی خدا کی
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ	طرف سے اس کے پاس آجاتا ہے اور
كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا	اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما
وَرَحْمَةً أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ	اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے
بِهِ ۔	(اوروں کے برابر ہے) وہی لوگ تو
(۱۷)	اس پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔ حضرت نوح ؑ کے سلسلہ میں آیا ہے:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن	اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو!

كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ
وَاٰتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ
فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا
وَاَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ۔
(۲۸)

تمھیں بتلاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے خاص اپنی رحمت سے مجھے نوازا ہے اور وہ تمھیں سجھائی نہیں دے رہی تو کیا ہم تم کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں جب کہ تم اس سے بیزار ہو

حضرت صالح کے بارے میں ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّيْ وَاٰتَانِيْ مِنْهُ رَحْمَةً
فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ
اِنْ عَصَيْتُهٗ۔
(۶۳)

اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تمھیں بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت سے مجھے نوازا ہے تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔

حضرت شعیب کے سلسلہ میں مذکور ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ
اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ
رِزْقًا حَسَنًا، وَمَا اُرِيْدُ
اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا
اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ۔
(۸۸)

اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تمھیں بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے رزق حسن سے بھی نوازا ہے، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھیں منع کر کے وہی چیز خود اختیار کر لوں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔

ان آیات میں "بیّنہ" (روشن دلیل) کے بعد وحی آنے کا ذکر ہے اور وحی کی تعبیر "شاہد" (گواہ)، رحمت اور رزق حسن سے کی گئی ہے۔ ان تعبیرات کے لیے قرآن مجید اور

پچھلے صحیفوں میں شواہد موجود ہیں۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ پیغمبر کے پاس جو وحی آتی ہے وہ اس چیز کی تائید اور وضاحت کے لیے ہوتی ہے جسے وہ جانتا ہے۔ چنانچہ اس سے اس کے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل عقل جو اللہ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ انھیں فطرت کی جانب سے جو الہام ہوا ہے وہ اس کی تائید کر رہی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ
فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ
زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا، فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ
اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔
وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا
اِلٰى رِجْسِهِمْ۔
(سورہ توبہ ۱۲۵-۱۲۶)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا؟ سو جو لوگ ایمان لائے وہ ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے تو وہ ان کی نجاست پر اور نجاست کا اضافہ کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو لوگوں کے لیے یاد دہانی بتایا ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جن کا قلب پاک ہو اور وہ فطرت کی جانب سے حاصل ہونے والے علم کے موافق اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں، جیسا کہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ
هُدًى۔ (سورہ محمد ۱۷)

جن لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی ان کی ہدایت میں اللہ نے افزونی بخشی

نیز فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى
الظُّلُمٰتِ۔ (سورہ بقرہ ۲۵۷)

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لائے۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت ہیں۔ وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

وحی عام یعنی الہام

وحی عام انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگ اسے محسوس کرتے ہیں جیسا کہ آپ کو اپنے قلب کے اندر ایک حکم دینے والے اور روک ٹوک کرنے والے کا احساس ہوتا ہے لیکن عمل اکثر جہل کی وجہ سے آلودۂ گناہ ہو جاتا ہے جس طرح ایک عادل جج جھوٹی شہادت کی وجہ سے غلط فیصلہ دے دیتا ہے۔ یہ وحی کی ایک عام صورت ہے۔

پھر انبیاء کو خاص طریقہ سے وحی کی جاتی ہے جو دوسرے انسانوں کو نہیں کی جاتی۔ ان دونوں میں فرق کرنے کے لیے لوگوں نے وحی عام کا نام الہام رکھا ہے لیکن قرآن مجید نے فطری علم کو الہام کہا ہے، جیسا کہ فرمایا:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا

پس اس کو سمجھ دی بدی کی اور نیکی کی۔

(سورہ والشمس ۸)

وحی کی پہلی تعلیم

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پیغمبر کو توحید، نماز، عدل اور انابت کی تعلیم دیتا ہے جس سے اس کے قلب کو اطمینان ہو جاتا ہے اور اس کی فطرت کو جس چیز کی طلب تھی اس کی وحی سے تسکین ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى، اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى، فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى۔

(سورہ طٰہٰ ۱۳-۱۶)

اور میں نے تجھ کو برگزیدہ کیا تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس لیے میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ قیامت آ کر رہے گی، میں اسے چھپائے رکھوں گا کہ ہر شخص کو اس کی کوششوں کا بدلہ دیا جائے۔ تو اس سے تمہیں غافل نہ کرنے پائے وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہش پر چلتا ہے، مبادا تم ہلاکت میں پڑ جاؤ۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو توحید اور آخرت کی تعلیم دی ہے۔ اور کفار کی مخالفتوں کے باوجود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملہ میں فرمایا:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(سورہ نحل ۱۲۰-۱۲۱)

بے شک ابراہیم اللہ کا فرماں بردار بندہ تھا، اسی کی طرف یکسو، اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا، اس کی نعمتوں کا شکر گزار۔ اللہ نے اس کو برگزیدہ کیا اور اسے سیدھی راہ بتلائی۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر پہلے نماز کا حکم دیا کہ:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ

خدا کا نام لے کر پڑھ جس نے بنایا۔ بنایا آدمی کو خون کے پھٹکے سے۔ پڑھ، اور تیرا خداوند بڑا کریم ہے جس نے سکھایا قلم سے۔

بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ (سورہ علق ۱-۵)
آدمی کو وہ شے سکھائی جسے وہ جانتا نہ تھا۔

آپ کو دو پہلوؤں سے نماز کا حکم دیا: ایک پیدائش کی نعمت کے پہلو سے اور دوسرے ہدایت کی نعمت کے لحاظ سے۔ اور یہ فرما کر کہ:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی۔ (سورہ علق ۸)
ضرور تیرے خداوند کے یہاں لوٹنا ہے۔

معاد کی طرف رہنمائی کردی۔ باقی سورہ میں سرکشوں کی رخنہ اندازیوں کے باوجود آپ کو نماز پر قائم اور ثابت قدم رکھا گیا ہے۔ اسی کے مثل پوری سورہ مزمل نازل ہوئی سوائے آخری آیت کے۔ اس میں آپ کو قیام لیل کی ہدایت کی گئی۔ اس کے بعد سورہ مدثر میں انذار کا حکم دیا گیا۔ اس میں حکمت کا پہلو یہ ہے کہ ان کو پہلے قرآن سنا دیا جائے پھر خطاب کیا جائے اور قبل اس کے کہ ان سے کچھ کہا جائے عمل کے ذریعہ ان کو دعوت دی جائے تاکہ سابقین پہلے ہی کھنچ کر آجائیں۔

توحید اور نماز کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ پیغمبر کو احسان یعنی خیر کا حکم دیتا ہے۔ اس سے اس کے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کیوں کہ یہ وحی فطرت کے موافق ہوتی ہے۔ تمام بھلائیوں کا سرچشمہ دو ہی چیزیں ہیں: ایک خدا کی یاد اور دوسرے غریبوں کے ساتھ ہمدردی۔ چنانچہ پیغمبر ایک طرف تو نماز اور خدا کی یاد میں لگا رہتا ہے اور دوسری طرف مخلوق کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہے، اور انھیں تمام بھلائیوں کی اصل یعنی نماز اور زکوٰۃ کی دعوت دیتا ہے۔ انھیں دو کے ذریعہ وہ لوگوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈراتا ہے کیونکہ ان کی خلاف ورزی تمام برائیوں اور فساد کی جڑ ہے۔

عصمت انبیاء

۱۔ عصمت انبیاء کی بحث محل نزاع رہی ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس میں غلو سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسے عقل سلیم ماننے سے ابا کرتی ہے۔ اور مسلمانوں کے یہاں اس باب میں جو نزاع ہے وہ اختلاف لفظی کے سوا کچھ نہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ لوگوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم یہ چاہتے ہیں کہ معاملہ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے اور ہم اس سلسلہ میں ایک زبان ہو جائیں نیز بعض غلط قسم کے دعوے کرنے والوں اور ان کے پیروکاروں کے ذہن پر جو تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔ اور اللہ خوف کھانے والوں کا مددگار ہے۔

۲۔ ہمارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گناہ اور برائیاں دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک ابرار کے گناہ، دوسرے عام لوگوں کے گناہ۔ بھول چوک کے قسم کی چیزیں جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں وہ پہلی قسم کے تحت آتی ہیں۔ گرچہ یہ بات بہت ہی باوزن ہے لیکن اس کی تفصیل اور وضاحت کی ضرورت ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ بندہ کا مواخذہ اس چیز میں ہوتا ہے جو اس پر واجب ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ حیوانات پر وہ احکام لاگو نہیں ہوتے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف امتوں کی گرفت ان چیزوں میں ہوئی جو ان پر فرض کی گئی تھیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے ہی انبیاء سے ان امور میں مواخذہ ہوا جن کے وہ حامل بنائے گئے تھے۔ عزم، بیداری اور ثابت قدمی اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ اگر ان میں کوئی کمزوری ان کو لاحق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قدم پھر

جما دیے اور انھیں غلطیوں سے محفوظ رکھا۔

رہا وہ معاملہ جو حضرت آدمؑ کو ابتدائے امر میں پیش آیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى، ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (سورہ طٰہٰ ١٢١-١٢٢)

اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اسے نوازا تو اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت بخشی۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (سورہ طٰہٰ ١١٥)

اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہیں پائی۔

تو اس سے یہ بات واضح فرمادی کہ حضرت آدمؑ نے درخت کا پھل کھانے میں اس اعتبار سے نافرمانی نہیں کی کہ انھوں نے بالقصد اس کا ارتکاب کیا جس سے انھیں روکا گیا تھا بلکہ عزم کی کمزوری کی وجہ سے ان سے بھول ہوئی اور نافرمانی ان سے سرزد ہوگئی۔ شیطان کی بات پر انھوں نے اس وقت کان دھرا جب اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ ان کا خیرخواہ ہے۔ اس نے موقع پاکر آپ کو دھوکے میں ڈالا اور بھول سے آپ نے اسے چکھ لیا۔ سورہ اعراف میں جو آیات اس سلسلہ میں وارد ہیں ان کی یہی تاویل ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ

اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو۔ بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والو بن جاؤ۔ لیکن شیطان نے ان کے اندر وسوسہ ڈالا تاکہ عریاں کردے ان کی شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ

أَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (١٩-٢٢)

تمھارے پروردگار نے تمھیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا ہے کہ تم فرشتے یا زندہ جاوید نہ بن جاؤ۔ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمھارے خیرخواہوں میں سے ہوں۔ اس طرح اس نے انھیں فریب میں مبتلا کردیا۔ تو جب انھوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہوگئیں اور وہ ڈھانکنے لگے خود کو باغ کے پتوں سے۔ تب ان کے رب نے انھیں آواز دی کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہ تھا اور تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت آدم سے یہ فعل قبل از نبوت سرزد ہوا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ۔ (سورہ طٰہٰ ١٢٢)

پھر اس کے رب نے اسے نوازا تو اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت بخشی۔

یہ الفاظ آپؑ کو نبوت دیے جانے سے عبارت ہیں۔ قابل غور چیز یہ ہے کہ جب حضرت آدمؑ جنت میں تھے تو اس وقت نبوت کا کیا کام تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نسیان قابلِ معافی ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ بے شک عام انسانوں کے حق میں یہ بات درست ہے لیکن جہاں تک ابرار کا تعلق ہے ان کے لیے اس چیز کو بھلا دینا جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے عہد لیا ہو گناہ کی بات ہے۔ اسی طرح دل میں خوف، اُلجھن اور رنج و ملال کا پیدا ہونا بھی ان کے لیے گناہ ہے حالانکہ ان سے کوئی بشر خالی نہیں۔

اور جہاں تک "معصیت" کا تعلق ہے تو قرآن مجید نے حضرت آدمؑ کے سوا کسی دوسرے نبی کی طرف اسے منسوب نہیں کیا، وہ بھی ان کے عہد کو بھول جانے کی وجہ سے اور نبوت ملنے سے پہلے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ پیغمبروں کو ہر لغزش سے بچاتا ہے۔ اس نے انھیں امام اور نور بنا کر بھیجا ہے اور ساری زمین کی بھلائی ان سے وابستہ کر دی ہے، جیسا کہ فرمایا:

فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۠ (سورہ جن ۲۷-۲۸)

تو وہ ان کے (یعنی پیغمبروں کے) آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے کہ دیکھے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور وہ ان کے گرد و پیش کا احاطہ کیے ہوئے اور ہر چیز کو شمار میں رکھے ہوئے ہے۔

پیغمبروں کی پرورش و پرداخت خصوصی اہتمام سے ہوتی ہے اور ان کے احوال پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظر رہتی ہے، کیوں کہ وہ تمام انسانوں کے مقتدیٰ اور راہبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اگر ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی ہے جس سے کسی طرح کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں اس سے باخبر کر دیتا ہے اور جادۂ مستقیم پر انھیں ثابت قدم رکھتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی ایک چیز سے احتراز فرمایا اس لیے کہ آپ خود کو اس سے پاک رکھنا چاہتے تھے جس میں آپؐ نے ایک نوعیت کا ضرر محسوس کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی اصل حقیقت سے آپؐ کو مطلع فرما دیا۔ دیکھیے کہ اس معاملہ نے کیا رُخ اختیار کیا اور لوگ کس طرح امرِ حلال سے رُک گئے اور ایک طرح کی رہبانیت کی طرف جانے لگے۔ اصل میں پیغمبر کی حیثیت قبلہ اور مرکز کی ہے۔ اگر اس میں خفیف سا بھی جھکاؤ ہو تو وہ بعد کے لوگوں کو بہت دور تک لے جا سکتا ہے۔

پیغمبر کے سوا کوئی معصوم نہیں

اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ پیغمبر کے علاوہ اور لوگوں سے لازماً بطور پر گناہ کا صدور ہوتا ہے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس معاملہ میں پیغمبر کے سوا ہم کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور نہ اسے معصوم سمجھ سکتے ہیں، کیوں کہ اگر ہم نے اسے نبی کی طرح مانا اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لی تو گویا ہم نے اسے پیغمبر بنا دیا۔

قرآن نے ہم کو بتایا ہے کہ پیغمبر اس دنیا سے سیدھا راستہ دکھانے کے بعد ہی رخصت ہوتا ہے۔ اگر لوگ اپنے نفس کی اتباع یا کسی گمراہ یا جابر حکمراں کی اطاعت میں اس راستہ سے ہٹ جاتے ہیں تو اس میں پیغمبر کا کوئی قصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صحیح راہ بتا دی ہے اور اپنی حجت قائم کر دی ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر زمانہ میں ایک معصوم بھیجے جس پر اس کی ویسی ہی عنایت ہو جو اس نے اپنے پیغمبروں کے لیے مخصوص کر رکھی ہے۔

امت کے لوگوں پر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو جانیں کہ جو کچھ ان پر نازل کیا گیا ہے اس کے لیے ان سے باز پرس ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ اسی کی پیروی کریں گے جسے اللہ تعالیٰ نے مکمل فرمایا ہے۔ اس لیے دین میں نہ تو کسی نئی چیز کی گنجائش باقی رہی اور نہ خلاف شرع باتوں میں سے کسی بات کی پیروی کے لیے جگہ چھوڑی گئی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اس ذمہ داری کی پوری طرح حفاظت کی جو امت پر ڈالی گئی تھی اور اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ امت میں عدل و قسط پر قائم رہنے والے لوگ موجود ہیں جو ہر کجی کو درست کر سکتے ہیں۔

چنانچہ پیغمبر کے بعد کسی قائد یا امیر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں کو من مانے ڈھنگ سے اپنے حکم پر چلائے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دے جسے وہ جانتے ہیں اور منکر سے روکے جسے وہ نہیں پہچانتے۔ قرآن مجید نے اسے غایت درجہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جیسا کہ وارد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔ (سورہ نساء ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی۔ اگر کسی امر میں تمہارا اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ طریقہ بہتر اور مآل کے اعتبار سے بہتر ہے۔

اس آیت سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کے رسول جس بات کا حکم دیں اس میں کوئی نزاع نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ اطاعت بالکل واجب ہے لیکن اولوالامر کے ساتھ یہ معاملہ نہیں۔ وہ کسی ایسی بات کا حکم دے سکتے ہیں جس میں نزاع پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بیماری ایسی تھی جس کا علاج ضروری تھا چنانچہ دوسری بات فرمائی کہ تنازعہ اور اختلاف کی صورت میں لوگ معاملہ کو خدا اور اس کے رسول کی طرف لوٹائیں۔ اس طرح ایک محکم اصول کی بنیاد رکھ دی گئی اور اللہ اور رسول کے سوا کسی کی مستقل اطاعت کو جائز قرار نہیں دیا گیا۔ دیکھیے کہ آیت میں "اَطِیْعُوْا" دو بار لائے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ پیغمبر کی اطاعت اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ وہ دست الٰہی کے نیچے ہوتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا پہرہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہ بات کسی اور کے ساتھ نہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے متعلق عصمت کا دعویٰ کرے یا یہ کہ ہم اسے معصوم سمجھیں۔

شفاعت

اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں اپنے احاطۂ علمی، وسعت رحمت اور بزرگی و عظمت کی دلیل سے مزعومہ شفاعت کو رد کر دیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صحیح شفاعت کو ثابت بھی کیا ہے جو یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا شفاعت چاہنے والے کے ساتھ استغفار کرے ۔ لفظ "شفاعت" کا اصل مفہوم یہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ۔ (سورہ منافقون ۵-۶)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں، اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ غرور کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے یکساں ہے تم ان کے حق میں استغفار کرو یا نہ کرو۔ اللہ ان کو ہرگز معاف کرنے والا نہیں، اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں شفاعت کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے آپ جان سکتے ہیں کہ شفاعت کا مطلب قیامت کے روز گواہی دینا ہے۔ اور یہ گواہی لوگوں پر اس بات کے

لیے ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں رسول کے ساتھ کیسا سلوک کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۔ (سورہ نساء ۴۱-۴۲)

اس دن ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر پیش کریں گے۔ اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی تمنا کریں گے کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے، اور اس دن وہ خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

دنیا میں شہادت کی صورت یہ ہے کہ جو لوگ تائب ہو کر آئیں پیغمبر ان کے لیے استغفار کرتا ہے، اور دوسرے کے لیے استغفار کرنا باہم محبت کے ساتھ جڑے رہنے کی علامت ہے۔ چنانچہ پیغمبر جب تک اپنی قوم کو چاہتا ہے اسی کا حصہ ہوتا ہے اور اس کے گناہ کو اپنا ہی گناہ محسوس کرتا ہے تا آنکہ اس سے اظہار برات کر دے۔ اور جب وہ برات ظاہر کر دیتا ہے تو ان سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک پیغمبر ہجرت نہیں کرتا اس کی قوم پر عذاب نہیں آتا اور یہی سبب ہے کہ توجہ کا رُخ ہمیشہ پیغمبر کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ۙ وَّعَلَى

اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے ساتھ دیا نبی کا مشکل کی گھڑی میں بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی نگاہ کی، بے شک وہ ان پر نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ اور ان

الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ (سورہ توبہ ۱۱۷-۱۱۸)

تینوں پر بھی جن کا معاملہ موخر رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں ضیق میں پڑ گئیں اور انھوں نے اندازہ کر لیا کہ خدا کے سوا کہیں اور پناہ نہیں۔ پھر اللہ ان پر مہربان ہوا تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چنانچہ شفاعت کا مطلب، جیسا کہ پہلے گزرا، آخرت میں شہادت اور دنیا میں تائب ہونے کے ساتھ استغفار ہے۔ اس سلسلے میں جو زعم باطل پایا جاتا ہے اس کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۔

.. ..

.. ..

اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کے اولاد ہے۔ وہ ان باتوں سے بہت ارفع ہے، بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے بلکہ اس کے حکم کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے وہ سب کچھ جو ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے (یہ اس شفاعت کے باطل ہونے کی دلیل ہے جس کا انھیں گمان ہے) وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ

.... پسند فرمائے اور وہ اس کے خوف سے
لرزاں رہتے ہیں۔ (سورہ انبیاء ۲۶-۲۸)

معلوم ہوا کہ اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت بے ادبی کی بات ہے، اسی لیے فرمایا کہ "وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ" (وہ اس کے خوف سے لرزاں رہتے ہیں) تو وہ کیسے اس کی جراُت کریں گے۔؟

پھر اس تصور سے اللہ تعالیٰ کا خوف ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ گنہگار اپنے شفاعت کرنے والوں پر تکیہ کر لیتے ہیں اور ان کی نظر میں عدل اور لزوم جزا کا کوئی وزن نہیں رہ جاتا اور وہ خدا سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھیے کہ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح واضح فرمایا ہے:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔

اور اسی کے ذریعے سے ان لوگوں کو خبردار کرو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا نہ شفاعت کرنے والا، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ (سورہ انعام ۵۱)

نیز یہ تصور شرک کی طرف لے جاتا ہے اس طور پر کہ شفاعت کے زعم باطل میں مبتلا لوگ اپنے شفعاء کو معبود بنا لیتے ہیں اور اللہ سے زیادہ ان سے محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ خدا کو جابر و قاہر اور غیض و غضب والا جان کر اس کے خوف سے بچنے کے لیے اپنے شفعاء کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر فرمایا ہے:

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ۔

اس کے سامنے نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا نہ شفاعت کرنے والا۔ (سورہ انعام ۵۱)

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے تھے اور اسی کو اپنی امید کا محور سمجھتے تھے اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آسرا تھا۔

مزید برآں شفاعت کے زعم باطل سے جس طرح شرک کا دروازہ کھلتا ہے اسی طرح کفر کا باب بھی وا ہوتا ہے، کیوں کہ اس سے خدا کی صفت علم و قدرت کا انکار ہوتا ہے جیسا کہ ماسبق آیت سے جو اوپر ہم نے نقل کی اس پر روشنی پڑتی ہے یا جیسا کہ فرمایا:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ۔

کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے۔ وہ باخبر ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے سب سے، اور وہ اس کے علم میں سے کسی ادنیٰ چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ (سورہ بقرہ - ۲۵۵)

انبیاء کے طریقۂ شفاعت کا کتنا خوب صورت انداز ہے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی شفاعت کے سلسلہ میں اختیار کیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (سورہ مائدہ - ۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر انھیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ نے ان کے عذاب کے معاملہ کو ان کے رب ہی کے حوالہ کر دیا اور اس کے کمال قدرت و حکمت کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو ان کی مغفرت کے لیے شفاعت کرنے سے الگ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ زمر میں فرمایا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا

کیا انھوں نے اللہ کے مقابل میں دوسروں کو سفارشی بنا لیا ہے! کہو،

لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۴۳-۴۴)

گرچہ وہ نہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے ہوں۔ کہہ دو کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، پھر تمھیں اسی کی طرف لوٹایا جانا ہے۔

چونکہ شفاعت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ جسے چاہے گا اس کی اجازت دے گا، اس لیے پہلے اسے راضی کرنا ضروری ہے تاکہ شفاعت قبول کی جا سکے۔

پیغمبر کی شفاعت

پیغمبر جس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کی طرف مبشر اور نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں اسی طرح وہ ان کے رب کے حضور ان کے وکیل اور شفیع بھی ہیں۔ پیغمبر کی پہلی شفاعت یہ ہے کہ اگر وہ ایمان لاتے ہیں تو ان کے لیے استغفار کرے، قرآن میں اس کا ذکر متعدد جگہوں پر آیا ہے۔ پھر اگر وہ گناہ کر بیٹھیں اور تائب ہو کر مغفرت چاہیں تو پیغمبر بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرے کیوں کہ وہ بندوں کا امین اور معتمد ہوتا ہے۔ اسی لیے بندوں پر واجب ہوا کہ اپنے معاملات اور قضیوں کو پیغمبر کے سامنے پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اسے نبی نہیں مانا۔ پھر قیامت کے دن وہ ان کی سفارش کریں گے۔

پیغمبر کے زمانہ کے بعد جو لوگ آئے اگر وہ توبہ و استغفار کرتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبائر کے سلسلہ میں ان کی توبہ کو پیغمبر کی شفاعت پر چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا

تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ۔ (سورہ نساء ۳۱)

تمھیں جن برائیوں سے روکا جا رہا ہے، اگر ان کے بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو تمھاری چھوٹی برائیاں ہم تم سے دور کر دیں گے۔

نیز فرمایا:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ۔ (سورہ نساء ۱۷-۱۸)

اللہ کو انھیں کی توبہ قبول کرنی ہے جو نادانی سے برائی کر بیٹھیں پھر جلد توبہ کر لیں، اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو برے کام کیے جائیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سامنے آجائے تو کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ان لوگوں کی توبہ جو مریں حالت کفر میں۔ انھیں کے لیے تو تیار کر رکھا ہے ہم نے دردناک عذاب۔

یعنی جلد توبہ کر لینے والوں اور نادانی سے برائی کر بیٹھنے والوں کی تو مغفرت ہوگی، لیکن ان لوگوں کی مغفرت نہ ہوگی جو برائی پر برائی کرتے چلے جائیں اور جب تک موت قریب نہ آجائے توبہ بھی نہ کریں۔ اور ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے حال پر اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا ہے یعنی وہ لوگ جو جان بوجھ کر برائیاں کرتے رہیں اور کبائر تک سے اجتناب نہ کریں۔ ایک زمانہ تک ان کا یہی حال رہا ہو پھر اس سے پہلے کہ ان پر موت کا حملہ ہو توبہ کر لیں اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہیں، انھیں پیغمبر کا زمانہ بھی نصیب نہ ہوا ہو کہ وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو قیامت کے روز خصوصی سفارش کی اجازت دے گا۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی

تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا	کہہ دو، اے میرے بندو! جنھوں نے
عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ	اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی
رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ	رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام
الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ	گناہوں کو بخش دے گا، وہ بڑا ہی
الرَّحِیْمُ ۔ (سورہ زمر ۵۳)	غفور رحیم ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور اس سے مغفرت چاہو کیوں کہ بخشنے والا وہی ہے۔

بندۂ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے امید باندھے رکھتا ہے اور اس سے ڈرتا رہتا ہے۔ اسی لیے وہ توبہ کرتا ہے اور مایوس نہیں ہوتا۔ اس بات کو یوں فرمایا ہے:

وَلَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ	اور اللہ کی رحمت سے مایوس
لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا	نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (سورہ یوسف ۸۷)	تو بس کافر ہوتے ہیں۔

شفاعت کے جو تین مواقع ہم نے بیان کیے ہیں ان سب میں پہلے گنہ گار کی طرف سے توبہ و استغفار ضروری ہے جس کے بعد ہی شفاعت ہوسکتی ہے۔ یہی شفاعت کی حقیقت ہے۔ کیوں کہ شفاعت کرنے والا استغفار میں فروتنی اور مغفرت چاہنے والے کی زبان ہوتا ہے اور تذلل اور دعا میں اس کا وسیلہ بنتا ہے۔ نماز اور دعائیں اسی اصل پر قائم ہیں۔ امام دعا مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ امت کی شفاعت کے لیے امت کے افضل لوگوں کو اپنے ساتھ دعا میں شریک کر لیتے ہیں تاکہ شفاعت مجادلہ نہ بن جائے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جبل زیتون پر ان کی آخری دعا کے موقع پر دیکھا گیا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر میں دعا کرتے دکھائی دیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور حضرت ابوبکرؓ کی پکار کو سنا اور اپنے وعدہ اور سنت کے مطابق اپنے پیغمبر اور ان کے اصحاب کی مدد فرمائی۔

رہی حضرت عیسیٰؑ کی پکار تو ان کے شاگردوں نے چونکہ ان کا ساتھ نہیں دیا اس لیے

وہ شفاعت نہ بن سکی۔ اسی سے حضرت مسیحؑ نے سمجھ لیا کہ یہود کے لیے اب کوئی امید باقی نہیں رہ گئی اور ان پر لعنت مسلط ہوچکی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے معاملہ کو اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا اور اس پر راضی رہے کیونکہ وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا اور حکمت کے ساتھ رحم فرماتا ہے۔ اگر گنہ گار بے پروا اور اعراض کرنے والا ہو تو اس کے لیے شفاعت نہیں ہوتی بلکہ مجادلہ ہوتا ہے، اور یہ نبی کی طرف سے کبھی کبھی ہوجاتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ وہ انتہائے شفقت میں عدل و حکمت کی رعایت نہیں کرپاتا۔ اور وہ اس میں قابل ملامت بھی نہیں ہے۔

مجادلہ

قرآن مجید اور توارات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت لوطؑ کی قوم کے لیے باصرار رحمت کی درخواست کی۔ ایسے ہی اپنے والد کی مغفرت کے لیے انھوں نے بہت زیادہ التجا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو تعریفی انداز میں بیان کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان لوگوں کے معاملہ میں ان کے اعمال کے لحاظ سے فیصلہ فرمایا اور واضح کردیا کہ حضرت ابراہیم کی جانب سے یہ اصرار ان کے یہ جاننے سے قبل ہوا تھا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں۔ اور جب آپ پر یہ بات واضح ہوگئی تو ان کے لیے دعا سے رک گئے۔ یہی انبیاء کرام اور اللہ کے صالح بندوں کے شایان شان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ہمارے لیے نمونہ کا کام دے۔

پھر ہم کو بتایا کہ ایسے شخص کے لیے استغفار کرنا جو اس کا مستحق نہ ہو آخرت میں کچھ نفع نہ پہنچائے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ بغیر زیادتی کے اس کے مطابق اسے بدلہ دے گا جیسا کہ اس کے اعمال گواہی دیں گے اور جیسا کہ پیغمبر کی اس کے متعلق شہادت ہوگی اور اسی کے ساتھ پیغمبر اور مومنین کو چاہیے کہ استغفار عام کریں تاکہ جو اس کا اہل ہو وہ اس سے مستفید ہوسکے۔

اوپر جو کچھ ہم نے کہا ہے اس پر قرآن مجید میں بہت سی آیتیں دلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ
النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ
اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ
خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ
يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ
خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ
مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ
مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ
اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى
مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝
هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ
عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ
فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ
يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝
وَمَنْ يَّعْمَلْ اَوْ يَظْلِمْ

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری
ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے
مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا
ہے (یعنی حق بات) اور بدعہدوں کے
حمایتی نہ ہو (یعنی ان کے تئیں رحم دلی
کی وجہ سے حق کے ساتھ فیصلہ کرنے سے
باز نہ رہو، جیسا کہ فرمایا: "ولا تأخذکم
بھما رأفۃ فی دین اللہ ان کنتم
تؤمنون باللہ والیوم الآخر"
سورہ نور ۲ ۔ (ان کے ساتھ کوئی نرمی
تمھیں دامن گیر نہ ہونے پائے اگر تم اللہ
اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ حکم نا
کے سلسلہ میں ہے) اور اللہ سے مغفرت
مانگو (یعنی توبہ کرنے والوں کے لیے عام
استغفار کرو) بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔
اور ان لوگوں کے لیے مجادلہ نہ کرو جو اپنے
آپ سے خیانت کر رہے ہیں (یعنی اپنے آپ
پر ظلم کر رہے ہیں اور توبہ نہیں کرتے چنانچہ
دوسروں کی مغفرت طلبی انھیں نفع نہ پہنچائے گی)
اللہ پسند نہیں کرتا (یعنی ناراض ہوتا ہے) ان
لوگوں کو جو بدعہد اور حق تلف ہیں (تو تمھیں

نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ
اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ۝

(سورہ نساء ۱۰۵ ۔ ۱۱۰)

ان کے لیے استغفار نہیں کرنا چاہیے) یہ
لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں
چھپتے حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے
جب وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں،
اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ سب کا احاطہ
کیے ہوئے ہے۔ یہ تم ہو جنھوں نے دنیا
کی زندگی میں ان کی مدافعت کی (یعنی قیامت
کے روز تم سے ایسے ہی کہا جائے گا)، تو
قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت
کرے گا یا کون ان کا ذمہ لے گا (یعنی
منافقین کی طرف سے کوئی دفاع کرنے والا
یا ذمہ داری لینے والا نہ ہوگا۔ اس لیے
ان کو لازم ہے کہ ڈریں اور توبہ کریں۔
کسی کے آسرے پر نہ رہیں کہ وہ قیامت
کے روز ان کی طرف سے دفاع کرے گا"
جیسا کہ آگے واضح فرمایا:) اور جو کسی
بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر
کوئی ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت
چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے
والا پائے گا۔

تبلیغ

پیغمبر کے سب سے بڑے اخلاق کا مظاہرہ اس کے کار تبلیغ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تبلیغ کو انبیا کا سب سے بڑا فریضہ قرار دیا ہے اور سب سے بڑی تبلیغ یہ ہے کہ پیغمبر حواری اور اصحاب کو منتخب کرے تاکہ وہ لوگوں پر گواہ ہوں جس سے نبی کا طریقہ ظاہر ہو اور تمام انسانوں کے لیے حق اور سعادت کی راہ واضح ہو جائے تاکہ سنت اور بدعت کے درمیان فرق کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اسی لیے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو چُنا اور انھیں گواہ ٹھہرایا اور اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے مسلم امت کے لیے دعا کی جس طرح نبی کی بعثت کے لیے دعا فرمائی اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔ نیز فرمایا کہ اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔

(سورہ نساء۔ ۱۱۵)

اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راستہ پر موڑ دیں گے جدھر اس نے منہ پھیرا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام انسانوں کے لیے تھی اور آپؐ شرائع کی تکمیل اور اتمام کے لیے آئے تھے اس لیے آپ نے صحابہ، اصحاب صفہ، معلمین کی جماعت اور عوام الناس اور بادشاہوں کے پاس بھیجنے کے لیے سفرا منتخب کیے۔

پھر اس معاملہ میں آپؐ نے مزید اقدام فرمایا یہاں تک کہ شرف صحبت میں عورتوں کا بھی

حصہ رکھا جو کثرت ازواج کے بغیر ممکن نہ تھا، آپؐ نے ازواج مطہرات کا انتخاب نہ ان کے حُسن کی بنیاد پر فرمایا اور نہ مال کی بنیاد پر چنانچہ وہ طبقۂ نسواں کی معلمات بنیں اور وہ اپنے اس فریضہ کو جانتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سیکھا اس کی تبلیغ میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ اس بات پر وہ آیت دلیل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کی ان مخصوص صفات کو بیان کیا ہے جو حصول دین کے سلسلہ میں اولیٰ وانسب تھیں۔ چنانچہ فرمایا ہے:

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰۗىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰۗىِٕحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا۔

(سورہ تحریم ۵)

بہت ممکن ہے کہ اگر وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کا پروردگار تمھاری جگہ تم سے بہتر بیویاں اس کو بہم پہنچا دے۔ اطاعت شعار، مومنہ، فرماں بردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، شوہر آشنا اور کنواریاں۔

"ابکار" کو آخری صفت کے طور پر بیان کیا، اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابکار میں سے انھیں کو چُنا جو دین کی زیادہ سمجھ رکھنے والی اور زیادہ عقل مند تھیں۔ اگر آپؐ نے ایک ہی بیوی پر اکتفا کیا ہوتا تو عورتوں میں آپ کی قریبی ساتھی نہ ہوتیں اور تبلیغ کے حق میں کوتاہی ہوتی۔

معجزہ

معجزہ اور خوارق پر لوگوں نے کافی طویل بحثیں کی ہیں اور اس میں ان کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض نے اس کے امکان ہی سے انکار کر دیا ہے اور بعض نبوت پر اس کی دلالت کے منکر ہیں، اور کچھ لوگوں نے اسے نبوت کے لوازم میں سے بتایا ہے حالانکہ یہ لفظ دین میں نیا داخل کیا ہوا ہے۔ نہ تو یہ قرآن مجید میں آیا ہے اور نہ سابقہ آسمانی کتابوں ہی میں یہ لفظ ملتا ہے، نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے اس میں بھی یہ مذکور نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "آیت" سے تمام تر معجزات ہی کو بیان کیا گیا ہے۔

پس طالب حق کے لیے ضروری ہے کہ اس نئے لفظ کو چھوڑ کر "آیت" کے مفہوم پر غور کرے اور اس کے موقع استعمال اور متعلقات پر نظر ڈالے، پھر خوارق اور معجزات کی بحث کو دیکھے تو اس پر جلد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس اصطلاح کو ترک کر دینا ہی اولیٰ ہے، کیوں کہ یہ ایسے تصور کو جنم دیتی ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہو گئی ہے۔

لفظ آیت اور اس کے ہم معنی الفاظ کا مفہوم

۱۔ آیت دلیل پیش کرنے والے اور جس پر دلیل پیش کی گئی ہو کے درمیان واسطہ ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: ظاہری اور باطنی۔ ظاہر میں تو وہ سب کی نظروں کے سامنے بالکل عیاں ہے لیکن اپنی دلالت کے پہلو سے وہ اسی کے لیے مفید ہو سکتی ہے جو غور و فکر سے کام لینا اور اس سے یاد دہانی حاصل کرنا چاہے۔ اس صورت میں اس کا ظاہر اس کے

باطن کی طرف متوجہ کرے گا۔ اور جو غور و فکر کا عادی نہ ہو اور یاد دہانی حاصل کرنا نہ چاہے اس کے لیے آیت میں کوئی دلیل اور نشانی نہیں ہے کیوں کہ اس نے ظاہر سے اوپر اٹھنے اور اس کے باطن تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ
عَنْهَا مُعْرِضُونَ۔ (سورہ یوسف ۱۰۵)

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں۔

یعنی اس کی دلالت کے پہلوؤں سے انھوں نے اعراض کیا اس لیے وہ غفلت سے بیدار نہیں ہو سکتے اور ان کی یہ غفلت خواہشات میں مشغول رہنے کی وجہ سے ہے گویا کہ انھوں نے گھٹیا اور معمولی درجہ کی چیز کے سامنے سر جھکا دیے ہیں۔ چنانچہ وہ دیکھتے ہیں لیکن نہیں دیکھتے، سنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کا بہت ذکر کیا ہے۔ یہ آیت بھی انھیں کے سلسلہ میں ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَ
لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ
لَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا
أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ
أَضَلُّ أُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔
(سورہ اعراف ۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں جن کی وہ بات نہیں مانتے، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہ لوگ تو بالکل غافل ہو چکے ہیں۔

سب سے بڑا جرم ان لوگوں کا ہے جنھیں کوئی نشانی دی گئی لیکن شہوات ان پر غالب آگئیں اور انھوں نے اپنے دل کی روشنی کو بجھا دیا، چنانچہ ان سے روح عمل سلب کر لی گئی اور وہ پیچھے کی طرف لڑھکنے لگے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي
آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا
فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ

اور سناؤ ان لوگوں کو اس شخص کا حال جس نے حق کو پہچاننے کے بعد اسے پس پشت ڈال دیا جیسا کہ دوسری جگہ ہے: فَكَمَثَا

مِنَ الْغَاوِيْنَ ٥ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۔

جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔ سورہ بقرہ (۸۹)

(تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ سو ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے) اس کی سرگزشت جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا' بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیات کے ذریعہ سے سربلند کرتے لیکن وہ زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہش کا پیرو بن گیا۔

(سورہ اعراف ۱۷۵-۱۷۶)

معلوم ہوا کہ خواہشات کی پیروی اور گھٹیا اور کمتر چیز کو بلند تر پر ترجیح دینا ہی اصل میں ساری بیماری کی جڑ ہے۔ البتہ جن کی روحِ عمل سلب نہ کی گئی اور ان میں قوتِ فکر کی کمزوری کی وجہ سے غفلت پیدا ہوئی ہو تو ایسے لوگ ذکر یا یاددہانی سے متنبہ ہو جاتے ہیں اور پھر یا تو خود غور و فکر کی طرف مائل ہوتے ہیں یا اہلِ فکر کی ان باتوں اور یاددہانیوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ آیاتِ الٰہی کے ذریعہ کرتے ہیں۔

غفلت کے بہت سے اسباب ہیں جن کی تفصیل کی یہ جگہ نہیں۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ آیات انھیں لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور جن کا ذہن انھیں آیات کے ظاہر سے پرے لے جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت بہت سی جگہوں پر بیان ہوئی ہے۔

۲۔ آیت عقل اور قلب دونوں کو بیدار کر دینے والی چیز ہے، خواہ وہ مشاہدہ کے ذریعہ سے ان تک پہنچے یا سماعت کی راہ سے آئے۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سماعت بصارت کو

متوجہ کرتی ہے یا سن کر نگاہ اوپر اٹھتی ہے جیسے کسی سوئے ہوئے شخص کو آپ آواز دیں اور وہ اپنی آنکھیں کھول دے۔ اسی بنا پر وہ آیت جس کی تلاوت کی جاتی ہے اس آیت کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے، کیوں کہ آیت متلوہ آیت مشہودہ پر سے حجاب کو ہٹاتی اور یہ بتاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک آیت ہے۔ اس طرح وہ آپ کے اور آیت مشہودہ کی معرفت کے بیچ واسطہ ہوتی ہے۔ یہ اس کا ایک پہلو ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس طرح آیات مشہودہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت و حکمت اور اس کی شان عزت و کبریائی اور عدل و جزا پر دلیل ہیں اسی طرح آیات متلوہ بھی ان پر دلیل ہیں بلکہ ان کی دلالت زیادہ مفصل اور واضح ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ آپ کو غور و فکر کی راہ بھی دکھاتی ہیں۔

اس کا تیسرا عام پہلو جو بہت ہی خوب صورت ہے یہ ہے کہ وحی و ہدایت کو محض نازل فرما دینا ہی اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے اور اس نے ہمیں یہ رزق عطا کیا کہ ہم اس کے شکر گزار بنیں اور شکر ہی سارے دین کی اصل ہے جیسا کہ فرمایا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (سورہ بقرہ - ۱۸۵)

اور اس لیے کہ بڑائی بیان کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت بخشی اور تاکہ تم شکر گذار بنو۔

نیز فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۔ (سورہ رحمٰن ۱-۲)

خدائے رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔

اسی لیے وحی کو رحمت اور رزقِ حسن کہا ہے۔ پھر آیت خود بول دیتی ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ہدایت ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے اور یہ اس کا چوتھا پہلو ہے۔

۳۔ اوپر جو باتیں ہم نے بیان کی ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آیت متلوہ میں تنبیہ و تذکیر کے گوناگوں پہلو پائے جاتے ہیں اس لیے وہ آیت مشہودہ کے مقابلہ میں زیادہ

وسیع اور زیادہ مکمل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اس سے انکار کرنے والوں کی بہت زیادہ ملامت کی ہے جس طرح آیات مشہودہ سے اعراض کرنے والوں کو کی ہے اور جس طرح اِنھیں بیّنات کہا ہے اسی طرح اُنھیں بھی بیّنات کہا ہے۔ اور دونوں کو "ذکری" اور "بصائر" کا نام دیا ہے اور ان سے نفع اٹھانے والوں کو اولوالالباب اور اہلِ عقل وفکر کہا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔

۴۔ اس تفصیل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید انسان کو ایمان اور عملِ صالح کی جو دعوت دیتا ہے وہ اس کی عقل اور بصیرت ہی کے پہلو سے دیتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کی انسانی فطرت کی جہت سے اسے بلاتا ہے جس سے وہ غافل ہوتا ہے یا جسے وہ بھلا بیٹھا ہے۔ قرآن مجید اس کو تنبیہ اور یاددہانی کرتا ہے تاکہ اس کی فطرت کے اس جہت کی طرف اسے لوٹالے جسے احسن تقویم کہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے اپنا نام "ذکر" اور "تبصرہ" رکھا ہے۔ اور چوں کہ وہ فکر ونظر اور علم وایقان کے ان اصولوں کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے جس سے اس کے فکر کو پختگی اور اس کے علم کو ایک مضبوط بنیاد مِل جاتی ہے جو اس کے شک اور حیرانی کو دور کرتی اور اس کے یقین کو مضبوط بناتی ہے اس لیے خود کو ہدیٰ، تبیان، حق، برہان، بصائر اور نور اور شفاء لما فی الصدور کہا ہے۔

۵۔ چوں کہ قرآن مجید کی دعوت کا رُخ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، انسان کی فطرت کی جانب ہے اس لیے اس دین کو دین فطرت کہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دین خلق اور امر ہر دو پہلو سے ضروری ٹھہرا جس طرح آنکھ، کان اور رحم دلی اور حیا ضروری چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پر انسان کی فطرت کو قائم کیا ہے اور انھیں چیزوں کا اسے حکم دیا ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ اس لیے جو شخص اس دین کے خلاف چلتا ہے وہ اپنی فطرت سے لڑتا ہے اور اپنی شخصیت کو بگاڑتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنی آنکھیں پھوڑے اور اپنے ہاتھ توڑ ڈالے یا کوئی مخدر چیز لے کر اپنی حس ہی کو ختم کر دے یا زہر پی کر خود کو مار ڈالے۔

فطری مذہب اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا فطرت تقاضا کرتی ہے اور اس چیز سے روکتا ہے جس سے فطرت روکتی ہے۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (سورہ روم ۳۰)

اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنائے ہوئے کو بدلنا جائز نہیں ہے، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

سیدھے دین کا پیمانہ یہی ہے۔ اسے "قیم" اس بنا پر کہا ہے کہ وہ اپنے آپ پر اور خود اپنی ہی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ اسے ماننا کسی اور چیز پر مبنی اور منحصر نہیں ہے۔ پس یہی دین حق اور واضح طور پر حق ہے۔

۶۔ قرآن مجید کی اس تصریح سے کہ یہ دین فطرت ہے بہت سے لوگ غلط سمت کو چلے گئے۔ ان کی غلطی کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(الف) انھوں نے گمان کر لیا کہ خلق میں تبدیلی محال ہے۔ یہ خیال ان میں آیت "لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" کا مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ حالانکہ یہ بات خلافِ مشاہدہ ہے کیوں کہ خلق میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور یہ خلاف نص بھی ہے جیسا کہ وارد ہے:

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ (سورہ نساء ۱۱۹)

اور میں اُن کو سمجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں گے۔

اور حدیث شریف میں بھی آیا ہے:

لعن اللّٰه الواشمة المستوشمة ۔ ۔ ۔ ۔ المغیرات خلق اللّٰه۔ ( )

اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے گودنے والیوں اور گودوانے والیوں پر جو اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑتی ہیں۔

پھر خود سیاقِ کلام اس سلسلہ میں نہی کا ہے۔ اگر یہ چیز محال ہوتی تو اس سے منع کرنے کا کوئی محل نہ ہوتا۔ یہ ممانعت بالکل اسی طرح کی ہے جیسی کہ آیت ذیل میں ہے:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۔ ... تو پھر حج کی حالت میں نہ شہوت کی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔ (سورہ بقرہ ۱۹۷)

(ب) انھیں خیال گزرا کہ خلق کے اندر تبدیلی بالکل اسی طرح محال ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اُس سنت میں جس کے متعلق کہا گیا ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۔ اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (سورہ احزاب ۶۲ و سورہ فتح ۲۳)

ان کا یہ گمان بھی گمانِ باطل ہے کیوں کہ قولِ الٰہی "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" میں فطرت سے مراد انسان کی وہ فطرت ہے جس کے خلاف چلنا اس کے لیے مناسب نہیں۔ اس وجہ سے کہ یہی دینِ قیم یا مذہب کی سیدھی راہ ہے۔ رہا سنۃ اللہ کا معاملہ تو اس سے اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا وہ ضابطہ یا طریقہ مراد ہے جس کی رعایت اس کے افعال میں ہوتی ہے یا جس کے مطابق اس کے افعال کا صدور ہوتا ہے۔ یہ اس کے عدل اور رحمت کا ضابطہ ہے جس کے موافق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نصرت اور مدد کا معاملہ ہوتا ہے اور ظالموں کو ان کی مدت پوری ہونے کے بعد نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔

(ج) انھیں گمان ہوا کہ سنۃ اللہ سے مخلوقات کے طبائع مراد ہیں۔ مثلاً آگ کے اندر یہ خاصیت ہے کہ وہ لوگوں کو جلا دیتی ہے۔ اس سے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ مخلوقات یا اشیاء کے خواص تبدیل نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر انھوں نے معجزات کا انکار کر دیا، اور ان لوگوں کی باتوں سے دھوکا کھا گئے جنھوں نے طبائع کو سنت اللہ کہا ہے۔ اس لفظ کو سب سے پہلے اس مفہوم میں "رسائل اخوان الصفا" والوں نے استعمال کیا۔ پھر صاحب حجۃ اللہ البالغہ نے ان کی پیروی کی حالاں کہ قرآن مجید میں کسی لفظ کی تاویل اس کے استعمالات کے لحاظ سے ہونی چاہیے جبھی وہ صحیح تاویل ہوگی۔

معجزہ انسان کے دائرۂ امکان سے باہر ہے

معجزہ وہ ہے جو انسان کی قوت و تدبیر کی حد سے باہر ہو۔ چنانچہ آیات معجزہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی امر پر دلیل بھی ہوتی ہیں۔ آیت کے اس مفہوم کی طرف رہبری اس واقعہ سے ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حواریوں کے لیے آسمان سے خوان نعمت اُتارنے کے سلسلہ میں بیان کیا ہے:

قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ ۔

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا (اس پیغام کے سلسلہ میں جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے مطالبہ پر خوان اتارتا ہے تو ہم سمجھ لیں گے کہ اس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے) اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں (دوسروں کے لیے اس بات کی جو ہم نے آپ کی رسالت کے سلسلہ میں دیکھی اور جانی۔ (سورہ مائدہ ـ ۱۱۳)

باقی معجزہ کے یہ معنی سمجھنا کہ یہ نبی کا فعل ہے تو دین و شریعت میں اس کی کوئی اصل

نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اسے پیغمبر کے ہاتھوں یا ان کی نبوت کی شہادت کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔ قرآن مجید اور پچھلے صحیفوں میں اس کی صراحت پائی جاتی ہے۔

کسی نبی کو یہ قدرت نہیں کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی آیت پیش کر سکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللّٰهِ
شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ
لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ
وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ
قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ
مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا
فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝
قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا
بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ
اللّٰهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ
مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا
أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا
بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝
وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ
عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا

ان کے رسولوں نے کہا کیا تمہیں
آسمانوں اور زمین کے وجود میں لانے
والے اللہ کے بارے میں شک ہے؟
وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے گناہوں
کو بخشے اور تمہیں ایک وقت معین تک
مہلت دے۔ وہ بولے تم تو ہمارے
ہی جیسے آدمی ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم کو
ان چیزوں کی عبادت سے روک دو
جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے
تو ہمارے پاس کھلا ہوا معجزہ لاؤ۔ ان
کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں تو
تمہارے ہی جیسے آدمی لیکن اللہ اپنے
بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنا
فضل فرماتا ہے۔ اور ہمارے اختیار
میں نہیں کہ ہم تمہارے پاس کوئی معجزہ
لاویں مگر اللہ کے حکم سے، اور ایمان
والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے
اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب

سُبُلَنَا ۚ وَلَنَصْبِرَنَّ
عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُونَ ۔

(سورہ ابراہیم ۱۰-۱۲)

اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت
بخشی اور تم جو ایذا ابھی ہمیں پہنچاؤ گے
ہم اس پر صبر کریں گے اور بھروسہ
کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ
کرنا چاہیے۔

اس سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ معجزہ لانا پیغمبر کا کام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو رسالت پر گواہی کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن اور دوسرے صحیفوں میں صراحت ہے۔ اگر یہ پیغمبر کا فعل ہوتا تو اس سے بجائے رسالت کے الوہیت ثابت ہوتی اسی لیے پیغمبروں کو یہ اعلان کرنا واجب ہوا کہ انھیں اس کی قدرت نہیں۔

معجزہ کی ضرورت

ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور دوسرے انبیا کرام میں سے کسی پر جھوٹ کی تہمت نہیں لگائی گئی تھی کہ انھیں اپنی صداقت کو ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی۔ لیکن جب انھوں نے اپنی قوم کو جزا اور توحید کی خبر دی تو لوگوں نے ان کی بات جھٹلا دی۔ اس لیے جزا اور توحید کا اثبات ضروری تھا، خود ان کی اپنی صداقت کو ثابت کرنا ضروری نہ تھا۔

چنانچہ انھوں نے توحید اور جزا پر دلالت کرنے والی عظیم آیات سے لوگوں کو خبردار کیا اور اظہار معجزہ سے اجتناب فرمایا کیوں کہ اس کی دلالت براہ راست نہیں بالواسطہ ہوتی ہے۔ معجزے اس لیے نہیں دکھائے جاتے کہ ان کا مطالبہ کرنے والے اس کی وجہ سے ایمان لائیں گے بلکہ اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی ان نشانیوں کو دکھاتا ہے تاکہ اس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے۔

معجزہ نبوت پر دلیل ہے

معجزہ یعنی آیت کے بارے میں ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ وہ کسی امر پر دلیل اور ثبوت ہوتی ہیں۔ معجزہ جن چیزوں پر دلالت کرتا ہے ان میں سے ایک نبی کی رسالت بھی ہے۔ قرآن مجید اور دیگر آسمانی صحیفوں نے اسے بصراحت بیان کیا ہے اور عقل سلیم بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے ذکر کے بعد فرمایا:

فَذٰنِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۔	یہ دو برہان ہیں تمھارے رب کی جانب سے فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جانے کے لیے۔ بلاشبہ وہ فاسق لوگوں کی جماعت ہے۔
(سورہ قصص ۳۲)	

جہاں تک عقل کے اعتبار سے آیت کے نبوت پر دلیل ہونے کا تعلق ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ عقل مثال سے کسی چیز کو مانتی اور قیاس کرتی ہے۔ رہا باعتبار نقل اس کے دلیل ہونے کا معاملہ تو اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۔	اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ! میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے آنکھیں کھول دینے کے لیے۔ اور میں تو اے فرعون تم کو ہلاک زدہ سمجھتا ہوں۔
(سورہ بنی اسرائیل ۱۰۱-۱۰۲)	

معجزہ آخری دلیل ہے

خرق عادت کا معجزہ اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کے علاوہ تمام طریقے بے اثر ہو جاتے ہیں کیوں کہ کھلی ہوئی نشانی کے بعد تو ایمان قبول کر لینا ہے یا پھر عذاب سے دوچار ہونا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۔ (سورہ انعام ۸)	اور اگر ہم فرشتہ کو نازل کرتے تو معاملہ ہی فیصل ہو جاتا۔ پھر انھیں مہلت نہ دی جاتی۔

عظیم فیصلہ کن معجزات کے لیے ایک وقت معین ہے

اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر چیز کے لیے ایک مُدت ٹھہرائی ہے اسی طرح معجزہ کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے لیکن وہ بسا اوقات اسے اپنی رحمت کی وجہ سے موخر کیے رہتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ صالح لوگ معجزہ کے بغیر ایمان لائیں گے۔ اس میں حکمت کا پہلو یہ ہے کہ ہدایت کا بیج اس فہم و بصیرت کے اندر سے نکلتا ہے جو پیغمبر کی تعلیم سے پیدا ہوتی ہے اور معجزہ کے ذریعہ ایمان محض تقلیدی ہوتا ہے۔ کیوں کہ معجزہ صرف اس بات کی گواہی دے سکتا ہے کہ اس نبی کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے۔ چنانچہ جو شخص معجزہ کی وجہ سے ایمان لاتا ہے وہ پیغمبر کی ہر بات کو اس طرح مانتا ہے جس طرح ایک مقلد کسی کی بات کو مانتا ہے۔ حالانکہ اگر لوگوں کی گردن میں تقلید کا طوق ڈالا گیا ہوتا تو عقل سلیم رکھنے والے اور مستعد ذہن کے لوگ اس بصیرت سے محروم رہتے جو پیغمبر کی لائی ہوئی باتوں پر غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ فیصلہ کن معجزات کے بعد صرف تازیانۂ عذاب ہی باقی بچتا ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔ اس کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب فکر و فہم کے راستہ سے ایمان لانے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔ جو شخص معجزہ سے پہلے ایمان نہیں لاتا اسے کم ہی اس کے بعد ایمان کی توفیق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ	پھر ہم نے اس کے بعد رسول بھیجے ان کی اپنی قوموں کی طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے

قَبْلُ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ (سورہ یونس ۷۴)	جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حدود سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتے ہیں۔

نیز فرمایا:

وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۔ (سورہ یونس ۱۰۱-۱۰۲)	اور ان لوگوں کو نشانیاں اور ڈراوے کچھ نفع نہیں پہنچاتے جو ایمان لانا نہیں چاہتے۔ یہ تو بس اس طرح کے دن کا انتظار کر رہے ہیں جس طرح کے دن لوگوں کو پیش آئے جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دو: انتظار میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

پس قیامت کی طرح معجزہ بھی فیصلہ کن ہوتا ہے جو کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسے بھی اللہ تعالیٰ پردۂ غیب میں رکھتا ہے اور نبی کو اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا دل لوگوں کے مطالبہ سے اتنا تنگ آ جاتا ہے کہ وہ یہ چاہنے لگتا ہے کہ معجزہ جلد ظاہر ہو تاکہ معاملہ کا ایک دم فیصلہ ہو جائے اور کبھی اپنی قوم پر معجزہ کے بعد ظاہر ہونے والے عذاب سے اسے ڈر معلوم ہوتا ہے اس لیے معجزہ طلب کرنے والوں پر اسے غصہ آتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ فریسیوں پر غضب ناک ہوئے۔

قرآن مجید نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ معجزات اور نشانیاں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور پیغمبر کو ان کا انتظار رہتا ہے جیسا کہ سورہ یونس میں ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۔	اور وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتاری جاتی؟ تم کہہ دو کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ تم لوگ انتظار کرو

(سورہ یونس ۲۰) میں بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہوں۔

یعنی جس فیصلہ کن معجزہ کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ تمہارے پاکر آکر رہے گا، البتہ اس کا ایک وقت معین ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور میں اسی کے انتظار میں ہوں۔

اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے :

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۔

(سورہ انعام ۵۷-۵۹)

کہہ دو میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے، اور نہ زمین کی تہ میں چھپا ایک دانہ اور نہ کوئی خشک اور تر چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔

نیز یہ بھی :

قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ (سورہ انعام ۶۶-۶۷)

کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ نہیں ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے، اور تم عنقریب جان لوگے۔

معجزات سے استدلال

یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے معجزات کے ذریعہ مطالب رسالت پر استدلال کیا ہو۔ جہاں تک نفس رسالت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملہ میں ایک صاف اور سیدھی دلیل عطا فرمائی جس سے سیدھے راستہ (صراط مستقیم) پر آپ کو قائم کیا۔ سیدھی دلیل وہ ہوتی ہے جو بذات خود بغیر کسی واسطہ کے دلالت کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسے کھلے ہوئے دلائل و براہین دیے جو مطالب رسالت پر دلیل تھے۔ چوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل تعلیم توحید اور اللہ تعالیٰ کے لیے خالص بندگی اور سرفگندگی کی تھی اس لیے آپؐ کا طریقۂ تعلیم بھی اسی کے موافق تھا، یہی وجہ ہے کہ آپؐ اپنے عجز کا اظہار فرماتے تھے کہ آپ کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ آپؐ کو غیب کا علم ہے اور نہ خود جسے چاہیں ہدایت دے سکتے ہیں بلکہ اپنے رب سے ڈرتے ہی رہتے ہیں اور اس کے حضور ایک عبد کی طرح کام کرتے ہیں، سارے فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام انبیاء کی تعلیم میں آپ یہی بات پائیں گے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہ چیز زیادہ وضاحت کے ساتھ اور کثرت سے ملے گی۔

قرآن ایک معجزہ ہے

ہم سب مسلمانوں کا بالاتفاق اس بات پر ایمان ہے کہ قرآن معجزہ ہے اور کسی میں یہ قدرت نہیں کہ اس کا مثل پیش کر سکے۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے گا تو ہمیشہ اس سے خود کو عاجز پائے گا۔ لیکن اس امر میں ایک رائے ہونے کے باوجود ہمارے علماء کے درمیان اس کے جہت اعجاز کے سلسلہ میں اختلافات ہیں۔ میرے نزدیک اور اکثر علماء کے خیال میں قرآن اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جن لوگوں کو اس سے اختلاف ہے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی ہدایت کے پہلو سے معجزہ ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے لوگ عاجز ہیں اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

ان سے کہہ دو کہ تم اللہ کے پاس سے کوئی اور کتاب لاؤ جو ان دونوں (یعنی تورات اور قرآن) سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو، میں اسی کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو۔ اگر وہ تمہارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کر لو کہ یہ بس اپنی خواہشوں کے پیرو ہیں، اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی میں لگ جائے۔ اللہ ظالموں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرتا۔ (سورہ قصص ۴۹-۵۰)

اسی وجہ سے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن کا اعجاز صرف اس کی ہدایت کے لحاظ سے ہے نہ کہ کسی اور پہلو سے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے ہماری بات کی تردید نہیں ہوتی کیوں کہ ہدایت اگر ایسے کلام میں پائی جائے جو غایت درجہ فصیح و بلیغ ہو تو وہ زیادہ راہ یاب کرنے والی اور زیادہ موثر ہوگی۔ چنانچہ اس کا یہ پہلو کہ وہ زیادہ ہدایت دینے والا کلام ہے اس کی نفی نہیں کرتا کہ وہ معجزانہ حد تک بلیغ ہے۔

وجہ اعجاز

۱۔ کلام کے اندر ایک شے ہوتی ہے جسے روح کلام کہنا چاہیئے۔ اس کی حقیقت انجانی ہوتی ہے لیکن اس کے آثار سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ۔

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمہیں زندگی (یعنی اعلیٰ زندگی) بخشنے والی ہے۔ (سورہ انفال ۲۴)

قرآن مجید میں جو بے پناہ تاثیر ہے اس کا اندازہ صرف ذوق سے ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں عربوں نے جو روایات نقل کی ہیں اور جو تاریخی واقعات ہمیں معلوم ہیں ان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ پس نور درخشاں اور برہان قاطع وہی ہے جیسا کہ تورات اور یحییٰ علیہ السلام کے مکاشفات میں نبی آخر الزماں کے متعلق بشارت ہے کہ: "اس کے منہ سے دودھاری تلوار نکلتی تھی" اور "وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا۔" (دیکھئے یوحنا عارف کا مکاشفہ ب ۱ ۱۷ و باب ۲ ۲۸)

۲۔ اس لحاظ سے قرآن مجید کے اعجاز کی حقیقت کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

البتہ اس کے اثرات کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ علامہ عبدالقادر جرجانی اور انھیں کی طرح بعض دوسرے لوگوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کی نحوی ترکیبوں اور وجوہ بلاغت میں پوشیدہ ہے تو یہ بات درست نہیں کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی چیز معجز نہیں ہے۔

۳۔ لیکن اس رائے کے مطابق فن بلاغت کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے منتہائے کلام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور کلام کے مختلف انواع اور ان کے درمیان مدارج کے فرق کا علم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کلام معجز پر نظر ڈالے تو اسے دونوں میں واضح طور پر فرق محسوس ہوگا اور وہ یہ جان لے گا کہ معجز کلام اپنی تاثیر کے لحاظ سے اور اس اعتبار سے کہ وہ دل کو پورے طور پر اپنے قابو میں کر لیتا ہے غیر معجز کلام سے الگ ہی کوئی چیز ہے خواہ اس کی حقیقت سمجھ میں نہ آئے، اور یہ الگ بات ہے کہ اس میں اسباب بلاغت بھی پائے جاتے ہوں۔

۴۔ اس طرح اعجاز قرآن کے سلسلہ میں بظاہر دو مختلف رائیں جو لفظ و معنی کے اعتبار سے پائی جاتی ہیں انھیں ایک ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے جمع کی صورت یہ ہے کہ اصطلاحی بلاغت پر قرآن کے اعجاز کا دار و مدار نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے اندر ایسی بلاغت ہے جس کی گہرائی کی تھاہ پانے اور جس کی ماہیت کو سمجھنے سے انسان قاصر ہے البتہ اس کا حیرت انگیز اثر حکما اور اہل عقل پر مرتب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

۵۔ اور اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھتے ہیں کہ حکما، اور اہل بلاغت کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کے معنوی اور لفظی محاسن کا شمار ختم ہونے کو نہیں آتا بالکل اسی طرح جیسے فطرت کے اندر اور زمین و آسمان میں نظر آنے والی آیات میں آپ اس بات کو پاتے ہیں۔

رسالت محمدی کی خصوصیات

بسا اوقات لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اس آخری بعثت کے امور کو سابقہ نبوتوں پر قیاس کر لیتے ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں رسالت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کو بیان کیا جائے۔ ذیل میں ہم اس کے بعض امتیازات کا ذکر کریں گے:

۱۔ یہ بعثت دین کو آخری اور مکمل صورت میں پیش کرنے کے لیے ہوئی ہے اس لیے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حکمت سے خالی ہو۔ چنانچہ اس تعبدی احکام نہیں ہیں۔ یہ بات ہم نے اپنی کتاب "اصول الشرائع" اور کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں واضح کر دی ہے۔

۲۔ چوں کہ یہ بعثت آخری، عمومی، فطری اور تکمیلی ہے، اور یہ سب ایک ہی باب سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے اس کی بنیاد عبادت کے سادہ اور فطری طریقوں، تقویٰ کے اصول اور ان تمام واسطوں کو، جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حائل تھے، ہٹا دینے پر قائم ہے۔ چنانچہ اس میں نہ تو اب نبوت کا کوئی سلسلہ باقی رہا اور نہ مذہبی پجاریوں اور دینی خدمت گاروں کا کوئی منصب قائم کیا گیا جیسا کہ یہود کے یہاں تھا۔

ہمارے لیے معروف میں امیر کی اطاعت اور اقتدار ضروری ہے خواہ وہ جبر و استبداد ہی سے کیوں نہ کام لے الا یہ کہ اس کی طرف سے کھلا ہوا کفر ظاہر ہو۔ اور ہمیں جماعت کے ساتھ مل کر رہنے، خود کو مستعد اور تیار رکھنے، صبر و استقامت سے کام لینے، اصلاح حال کرتے رہنے اور باغیوں کے ساتھ اس وقت تک قتال کرنے کا حکم ہے جب تک کہ وہ خدا کے فیصلہ کی طرف رجوع نہ کر لیں۔

غرض یہ کہ یہ شریعت آزادوں کی شریعت ہے جو باہمی صلاح ومشورہ سے کام کرنے، عقل وفہم کو استعمال میں لانے اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑے رہنے پر قائم ہے تاکہ خدا کے بجائے دوسروں کو ہم ارباب نہ بنا بیٹھیں۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ لوگ کس طرح شرک اور کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو گئے جنھوں نے اپنے ائمہ کے معصوم ہونے اور ان کے اوپر وحی آنے کا عقیدہ بنا لیا اور اپنے ذہن معطل کر دیے۔ وہ اسے کتاب الٰہی کے فہم کے لیے استعمال میں نہیں لائے یہاں تک کہ قرآن ہی کو پس پشت ڈال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان نے کفر اور گمراہی کی ہر بات ان کے سامنے مزین کر کے رکھ دی اور کتاب اللہ کے جادۂ مستقیم اور نور مبین سے ہٹا کر انھیں دور لے گیا۔

("عیون العقائد" کی فصل "الرسالہ" کے بعض مباحث کا ترجمہ)

مطبوعہ تصانیف امام فراہیؒ

اُردو:

- تفسیر نظام القرآن (مجموعہ تفاسیر فراہی)
- اقسام القرآن
- ذبیح کون ہے؟
- آنحضرتؐ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب
- اسباق النحو (اول و دوم)
- تحفۃ الاعراب (منظوم)

فارسی:

- نوائے پہلوی (فارسی دیوان)
- خرد نامہ (منظوم)

عربی:

- الامعان فی اقسام القرآن
- الرای الصحیح فی من ھو الذبیح
- جمھرۃ البلاغۃ
- رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن (وھی تشتمل علی ثلاث رسائل: دلائل النظام، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل)۔
- فی ملکوت اللہ
- القائد الی عیون العقائد
- تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان (زیر طبع)
- مفردات القرآن۔ دراسۃ وتحقیق، الدکتور محمد اجمل الاصلاحی (زیر طبع)
- دیوان المعلم عبد الحمید الفراھی
- امثال آصف الحکیم

دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)